

دینی حلقوں میں عدم برداشت..... مضمرات و نتائج

دینی حلقوں میں عدم برداشت کی موجودہ کیفیت نئی نسل کے لیے انتہائی اضطراب کا باعث بن رہی ہے۔ بات بات پہ فتوے، تنقیدات، الزامات اور تہمتوں کی اس روش نے ذہنی ارتداد کی کیفیت کو جنم دیا ہے۔ ہمارے سنجیدہ اہل علم کو اس معاملہ میں باہم سوچ و بچار کے بعد ایسی مشترکہ پالیسی طے کرنی چاہیے جس کے باعث ایسے معاملات کی راہ روکی جاسکے۔ کوئی رائے دینے، کچھ کہنے اور لکھنے سے پہلے اس کے تمام مثبت و منفی پہلوؤں پر نظر رکھنی چاہیے۔ فوائد اور نقصانات اگر مد نظر ہوں تو امید ہے کہ اختلافات کی صورتیں کم ہی پیدا ہوں گی۔ محض شخصی اور ذاتی مقاصد و مفادات کے حصول کی خاطر کسی رائے کے اظہار میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ دوسروں کو جبراً قائل کرنے کے بجائے صبراً قائل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہمارے اکابر اپنے اصاغر کی اصلاح اس انداز میں کریں کہ وہ محسوس کریں کہ جیسے والد اپنے بیٹے کی اصلاح کرتا ہے ایسے ہی یہ بزرگ ہماری اصلاح فرما رہے ہیں۔

تنقید اور جارحانہ انداز اصلاح، اصلاح کی بجائے فساد کا سبب بنتا ہے۔ ہم محض جذبات کی رو میں بہہ کر ایسی باتیں لکھ دیتے ہیں کہ ہمیں احساس ہی نہیں ہوتا کہ یہ ہم نے کیا کر دیا ہے؟ اور جب پانی سر سے گزر جاتا ہے تو پھر سوائے پچھتاوے کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ سانپ گزر جائے تو لکیر پیٹنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ پہلے تو لو پھر بولو۔ اسی طرح لکھتے ہوئے بھی ایک ایک لفظ سوچ سمجھ کر لکھنا چاہیے، تقریر سے زیادہ تحریر اثر انداز ہوتی ہے۔ اگر ہمارے اندر یہ احساس پیدا ہو جائے کہ ہم نے بولے جانے والے ایک ایک کلمہ اور لکھے جانے والے ایک ایک لفظ کا اللہ رب العزت کے سامنے جواب دینا ہے تو ہماری زبان اور قلم بہت ہی محتاط ہو جائیں۔

ہمیں اندازہ ہی نہیں کہ ہماری منفی تحریروں کے نقصانات کتنے زہریلے مرتب ہوتے ہیں۔ ہمارا مخالف اور مخاطب تو جو اثر لے وہ تو ہے ہی مگر اس طرف ہمارا دھیان نہیں جاتا کہ دین دشمن افراد اور جماعتوں کے پاس ہمارا تمام ریکارڈ محفوظ ہو رہا ہے اور وقت آنے پر وہ ہماری نسلوں کو، ہم ہی سے نہیں بلکہ دین اسلام سے بدظن اور برگشتہ کرنے کے لیے استعمال کریں گے، جیسا کہ ”تاریخ احمدیت“ لکھ کر قادیانیوں نے کیا ہے اور منکر تین حدیث اپنی کتابوں میں کر رہے ہیں۔ صرف مذہب کا سرطان۔ (مرتب: کوثر جمال)، تاریک اجالے، حقیقی علماء اور جعلی علماء۔ احتساب یا

انقلاب، حقیقی عبادت جعلی عبادت۔ (مرتب: مشتاق احمد) اور پسِ نوشت (ڈاکٹر پرویز پروازی) کا دیکھنا ہی اس حوالہ سے ہماری آنکھیں کھولنے اور غفلت کی چادر اتارنے کے لیے کافی ہوگا۔

پورے ملک میں چند گنی چنی شخصیات کے استثناء کے بعد ہمارے ہاں کون ہے جو اس نہج پر سوچ کر بولے اور لکھے؟ ہم پہلے جذبات کی رُو میں بہہ کر ایسی باتیں اور فتوے تحریر کر جاتے ہیں اور بعد میں ان کی وضاحتیں پیش پیش کرتے کرتے عمر بیت جاتی ہے۔ آغاز ایک تحریر سے ہوتا ہے اور اختتام ایک کتاب پر جا کے ہوتا ہے۔ کئی ایسی مثالیں موجود ہیں کہ فتویٰ پہلے دے دیا جاتا ہے اور فریقِ ثانی سے متعلق دلائل و شواہد بعد میں اکٹھے کئے جاتے ہیں۔

کراچی کی ایک بہت بڑی علمی شخصیت نے ایک تنظیم کے خلاف فتویٰ تحریر فرمانے کے بعد مردان کے ایک عقیدت مند کو تحریر کیا کہ فتویٰ تو میں نے دے دیا ہے مگر ان سے متعلق بنیادی معلومات بھی مجھے نہیں ہیں۔ آپ براہ مہربانی ان سے متعلق بنیادی معلومات مجھے فراہم کریں..... ہمارے ایک انتہائی قابلِ احترام ”کالم نگار“ دوست نے ایک دفعہ حضرت مولانا زاہد الراشدی مدظلہ العالی سے استفسار کیا تھا کہ حضرت! ہم جب لکھتے ہیں تو بار بار کانٹ چھانٹ کرنی پڑتی ہے، تین چار دفعہ کی ریاضت کے بعد کہیں جا کے ”کالم“ مکمل ہوتا ہے جب کہ آپ کو بار بار دیکھا کہ آپ لکھتے بیٹھتے ہیں اور ایک ہی نشست میں اپنا ”کالم“ مکمل کر لیتے ہیں اور اس میں کہیں کانٹ چھانٹ بھی نہیں کرتے، تو اس کی وجہ کیا ہے؟ مولانا زاہد الراشدی صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا بھائی! آپ لکھنے کے بعد سوچتے ہیں اور میں لکھنے سے پہلے سوچتا ہوں۔ دوسری طرف وہ ہیں کہ ”کالم“ ہی نہیں ”فتویٰ“ ارشاد فرمانے کے بعد سوچتے ہیں بلکہ بعض تو فتویٰ جاری کرنے کے بعد بھی نہیں سوچتے.....! اناللہ وانا الیہ راجعون۔

پھر نوبت یہاں تک جا پہنچتی ہے کہ فریقین میں تبادلہ دلائل کا نہیں الزامات و اعتراضات کا ہوتا ہے۔ اور یہ الزامات و اعتراضات بھی علمی نہیں ذاتی نوعیت کے ہوتے ہیں اور ہم اُسے تحریر کا حسن سمجھتے رہتے ہیں کہ جتنا کسی کی ذات پر کیچڑ اچھالیں گے اتنا ہی تحریر میں زور پڑے گا اور ادب کی چاشنی بڑھے گی ہمیں یہ احساس سرے سے نہیں ہوتا کہ ایسا کر کے ہم کسے خوش کر رہے ہیں اور ہماری ان تحریروں سے کل فائدہ کون اٹھائے گا؟

ابھی تک ہماری ماضی کی تحریروں سے ہی گلو خلاصی نہیں ہوئی، پہلے ہی اعتراضات و جوابات کا سلسلہ تھمنے نہیں پایا کہ اب مزید نئے نئے مسائل نے جنم لینا شروع کر دیا ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ فریقین میں عدم برداشت اور عدم حوصلہ ہے۔ ہر فرد، ہر ادارہ، ہر جماعت یہی سمجھتی ہے کہ جو ہماری رائے ہے وہی ”اقرب الی الحق“ ہے اور اب تو بات اقرب سے ہٹ کر ”عین الحق“ تک پہنچ گئی ہے کہ جو میں کہتا ہوں، جو میرا نظریہ ہے، جو میری سوچ ہے، جو میں لکھتا ہوں، وہی حق ہے، صحیح یہ ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ باطل، لغو اور غلط ہے۔ انسا ولا غیر یہی آج ہمارا انعرہ ہے۔ اسی سوچ اور نظریے نے آج ہمیں جس مقام پر لا کھڑا کیا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ ایسے معاملات میں شیطان اور اس کے چیلے ہمارے سامنے ایسے ایسے دلائل لا کر رکھ دیتے ہیں کہ پھر ہم رکنے اور ٹھہرنے کا نام تک نہیں لیتے اور ایک دوسرے پر ایسے تاہز توڑ حملے کرتے ہیں کہ الامان والحفیظ۔

خدا را ہمارے اکابر و معاصر اپنے اس عمل پر نظر ثانی فرمائیں اور امت کے اس بکھرے شیرازے کو مزید انتشار

وافراق کی دلدل میں نہ دھکیلیں۔ اکابر کے ساتھ ساتھ اصغر کو بھی اس کا احساس کرنا چاہیے کہ:

موج ہے دریائیں بیرون دریا کچھ بھی نہیں

الخیر مع اکابر کم، البرکة مع اکابر کم اور البرکة مع اکابر کم اہل العلم کا سنہری اصول ہمارے سامنے رہنا چاہیے، اکابر اُمت سے جب ہم کٹیں گے تو پھر ایک آوارہ پتا ہی ہو کر رہ جائیں گے، ہوا جدھر چاہے گی ہمیں لے جائے گی اور چلو اُدھر کوچدھر کی ہوا ہو، کا مصداق بن کر رہ جائیں گے۔ پتا شاخ کے ساتھ جُوا ہی اچھا لگتا ہے۔ جو پتا شاخ سے ٹوٹ کر گر جائے وہ پھر پاؤں تلے ہی روندنا جاتا ہے۔ یہ نعرہ، یہ سوچ، یہ فکر، یہ نظریہ اور یہ انداز قطعی مناسب نہیں ہے کہ ہم کہتے پھریں، اکابر کون ہوتے ہیں؟ ہم اکابر کو نہیں مانتے..... ہمیں اکابر کی راہ نہیں اپنانی..... اور بعض تو اپنی تقاریر میں یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ موجودہ اکابر کی سوچ اور نظریہ ہمارے جوتے کی نوک پر.....! یہ تمام الفاظ، یہ نظریہ اور یہ سوچ ہمارے ”باغیانہ پن“ کی عکاسی کرتے ہیں۔

ہماری ذاتی حیثیت کچھ بھی نہیں ہے۔ ہماری تمام تر عزت، وقار، مرتبہ اور مقام اپنے اکابر ہی کا مرہون منت ہے، اکابر ہی سے وابستگی میں ہماری بقا کا راز ضمیر ہے۔ اگر ہم اپنے اکابر سے بغاوت کریں گے اور ان سے کٹ کر زندگی گذاریں گے تو پھر:

ہماری داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

ہمارا مقصود یہ باور کرنا بھی نہیں ہے کہ اکابر ”معصوم“ ہیں۔ ان کی ہر بات کو آنکھیں بند کر کے تسلیم کر لیا جائے۔ جہاں ہمیں ان کی رائے اور موقف سے اختلاف ہو وہاں انتہائی متانت، شائستگی اور ادب و احترام کے دائرے میں رہتے ہوئے ان سے اختلاف رائے کیا جائے اور اس میں انداز جارحانہ اور گستاخانہ نہ ہو۔ جہاں کہیں کسی معاملہ میں اختلاف ہو تو آپس میں مل بیٹھ کر ان معاملات کو حل کر لینا چاہیے، رسائل و جرائد اور کانفرنسوں میں ان اختلافات کو نہیں اچھالنا چاہیے۔ اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اکابر کا موقف ہماری رائے کے موافق نہیں اور ہماری سوچ، فہم اور دانست کے مطابق صحیح نہیں ہے اور وہ بھی اپنے موقف کی غلطی کو ماننے کے لیے تیار نہیں تو پھر خاموشی سے ان سے علیحدگی اختیار کر لی جائے اور ان اختلافات کو مزید ہوانہ دی جائے۔

ہمیں اپنی رائے منوانے پر اصرار نہیں کرنا چاہیے، ہم اس کے مکلف قطعاً نہیں ہیں کہ ڈنڈے اور گولی کے زور پر اپنے موقف کو منوائیں، جو مانتا ہے مانے، نہیں مانتا نہ مانے۔ ہمارے ذمہ صرف اتنی بات ہے کہ اپنے اس موقف اور رائے کی وضاحت ان کے سامنے کر دیں اور بس.....!

ایک دوسرے کی ذات پر کیچڑ اچھالنے کے بجائے اگر اصلاح کا پہلو سامنے رکھا جائے تو امید ہے کہ اس کے اچھے نتائج مرتب ہوں گے اور ہم یہ بھی امید رکھتے ہیں کہ ہماری اس درخواست کو درخور اعتنا سمجھا جائے گا اور اس سے بے اعتنائی نہیں برتی جائے گی۔

(بشکریہ ماہنامہ ”الحامد“ لاہور)